© rasailojaraid.com

تجویز (7): تعلیمی نظام اور مقابلے کے امتحانات کو اس میں فی الحال شامل نہیں کرنا چاہیے۔

یہ "فی الحال" قومی زبان کی ترویج کو "غیر معینہ مدت" تک ملتوی کرنے کے مترادف ہے۔ جب تک تعلیمی نظام انگریز کی غلامی کا آئینہ دار رہے اور مقابلے کے امتحانات میں منہ ٹیڑھا کر کے انگریز بننے والوں کو ہی آگے آنے کا موقع دیا جائے؛ تو بیچارے "قومی زبان" کے لیے خلوص کا انجام "عبرتناک" ہونے میں کیا رکاوٹ حائل ہوگی؟!

سفارش (iv): "تعلیمی اور نصابی معاملات میں اردو کو رائج کرنے کے لیے ہائر ایجوکیشن کمیشن اور صوبائی حکومتوں سے مشاورت کے بعد اقدامات اٹھائے جائیں۔"

اردو نصابِ تعلیم کے نفاذ کے لیے ان سے مشاورت کے بجائے عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر عمل درآمد کا حکم دیا جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہائر ایجوکیشن کمیشن اور صوبائی حکومتیں بھی عدالت عظمیٰ کے احکام پر عمل کے پابند ہیں۔

سفارش (x): پے سکیل 17 سے نیچے کے امتحانات ہی اردو میں لیے جائیں۔

اس سے اوپر کے امتحانات اب بھی دستورِ پاکستان کے خلاف انگریزی میں لینے سے اعلیٰ عہدوں پر بدستور انگریزوں کی ذہنی غلامی میں مبتلا افراد ہی براجمان ہوتے رہیں گے؛ جن کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں۔ اس طرح قومی زبان کو رائج کرنے کا خواب پھر طاق نسیان کی زینت بن جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

بہر حال "قومی زبان" کو سرکاری اور قومی سطح پر نافذ کرنا مسلمانانِ پاکستان کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ پرخلوص کوششوں کے ذریعے اس کی راہ میں حائل مذکورہ بالا اور دیگر رکاوٹوں کو دور کیے بغیر اس کا رائج کرنا آسان نہیں ہوگا۔

"قومی زبان کے نفاذ" سے کہیں زیادہ دستورِ پاکستان کی وہ شقیں لائق اعتناء اور واجب العمل ہیں، جن میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کو حقیقی معنوں میں "اسلامی" بنانے کا فیصلہ ہے۔ یعنی "کتاب الٰہی اور سنت نبوی کا نفاذ" یہی اس اسلامی ملک کے تمام مسائل کا واحد حل ہے، اور اللہ پاک سے کیے گئے اس اجتماعی اور قومی عہد و پیمان کو پورا کیے بغیر پاکستان کے عوام اور حکومت کو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ بندوں کی دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کس نظام حکومت میں ہے؟ اس حقیقت کو بندوں کا خالق و مالک ہی بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا اسی مالک دوجہاں کا نازل کردہ نظام نافذ کرنا ہماری حکومت پر لازم ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درسِ قرآن مجید

تراثِ رحمانی در فوائدِ قرآنی

ڈاکٹر محمد اسماعیل امین

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ٦٢﴾ [البقرة ٦٢] "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی، نصاریٰ اور صابی ہو گئے، جو بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے تو ان کے لیے ان کا اجر وثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

سابقہ آیات سے ربط اور مختصر تفسیر

اس آیت مبارکہ سے پہلی اور بعد کی آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کی ہوئی انعامات اور ان کے مقابلے میں ان کی بداعمالیوں کا تذکرہ فرمایا۔ یہ آیت درمیان میں ایک خاص مناسبت پر آئی ہے کہ سابقہ آیات میں بنی اسرائیل پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے جو ذلت اور حاجتمندی مسلط کر دی گئی؛ وہ تمام بنی اسرائیل پر نہیں تھی، بلکہ ان میں مخلص مؤمن بھی تھے، جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صدق دل سے ایمان لایا، توحید الٰہی اور اپنے انبیاء کرام کی سیرتوں پر عمل پیرا رہے۔ اسی طرح نصرانیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خلوص دل سے ایمان لا کر انجیل پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے والے بھی تھے۔ صابیوں میں بھی اپنے نبی علیہ السلام کی شریعت پر مخلصانہ عمل کرنے والے مؤمن گزر چکے ہیں۔ اسی طرح آخری نبی ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت معاصر بنی اسرائیل میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی تھے، جنہیں ان کے خلوص اور مستحکم ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق سے نوازا، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ وغیرہ، تو ان تمام اہل ایمان کے لیے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا اجر وثواب ان کے رب کے ہاں بالکل محفوظ ہے۔ یہود و نصاریٰ کو مانوس کرنے کی خاطر مسلمانوں اور صابئین کا بھی ساتھ ذکر کیا گیا۔

آیت کے سببِ نزول کے بارے میں حضرت مجاہدؒ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے نبی کریم سے ان اہلِ دین کے بارے میں سوال کیا جو زمانہ اسلام سے پہلے میرے ساتھی اور عبادت گزار تھے۔ تو اس موقع پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔" حافظ ابن حجرؒ نے اس کے راویوں کو "ثقات" قرار دیا ہے۔ [اتحاف المهرة رقم: ٥٧٦٥]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام سعید بن جبیرؒ اور سدیؒ کی روایت میں مزید تفصیل وارد ہوئی ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل کتاب ساتھیوں کے بارے میں کہا کہ وہ بڑے عبادت گزار ہونے کے ساتھ نبی آخر الزمان ﷺ کے منتظر بھی تھے؛ لیکن وہ آپ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے۔ جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جہنمی ہیں۔'' اس جواب پر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بہت زیادہ فکرمند ہوئے۔ اس کے بعد یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے یہودیوں میں سے تورات پر عمل کرنے والے نجات پائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان پر ایمان لانا نجات کے لیے ضروری تھا۔ اسی طرح نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے بعد تمام اہل کتاب پر حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے، ورنہ وہ نجات نہ پا کر ہلاک ہو جائیں گے۔ [ابن أبی حاتمؒ، الطبریؒ، ابن کثیرؒ]

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حدیث جبریل علیہ السلام میں مذکور ارکانِ ایمان پر پختہ یقین کر لیا، ارکانِ اسلام پر عمل کیا۔

بعض مفسرین، آیت کے سیاق سے شبہ میں گرفتار ہو کر کہتے ہیں: چونکہ یہاں اہل ایمان کا ذکر یہود و نصاریٰ اور صابئین کے ساتھ ہوا ہے، اس لیے یہاں ''ایمان والوں'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف بظاہر ایمان قبول کیا، یعنی منافقین۔ لیکن یہ قول ہرگز درست نہیں۔ جمہور مفسرین کرامؒ نے اس سے وہ نفوس قدسیہ رضی اللہ عنہم مراد لیا ہے جنہوں نے نبی آخر الزمان ﷺ کی تصدیق کی اور آپ کے سچے پیروکار بن گئے۔ امت محمدیہ کی صفت میں ''ایمان'' کا ذکر آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی حقیقی مؤمن ہیں، اور ان کا ایمان مضبوط اور یقین مستحکم ہوتا ہے۔ وہ تمام انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں کو اس کے تقاضوں کے مطابق مانتے ہیں۔ امام بغویؒ نے ایک اور قول نقل کیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے فطرت سلیمہ اور دین ابراہیمی پر قائم تھے، جیسے قس بن ساعدہؒ، حبیب النجارؒ، زید بن عمرو بن نفیلؒ وغیرہ

﴿وَالَّذِينَ هَادُوا﴾ سے مراد یہودی ہیں۔ ''یہود'' کی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے یہوذاؒ کی طرف منسوب ہے۔ اور عرب ذال کو دال سے بدل دیتے ہیں۔ اس طرح یھوذا میں عجمی سے عربی بنتے ہوئے ایک حرف کی تبدیلی واقع ہوئی۔

(۲) یھود (یتھوَّدُونَ) بمعنی یتحرَّکونَ سے مشتق ہے، چونکہ وہ تورات پڑھتے وقت اپنے جسموں کو حرکت دیتے تھے، اس لیے یہ نام پڑا۔

(۳) یہ تَھَوَّدَ بمعنی: تاب سے مشتق ہے یعنی ''توبہ کرنا''۔ ان کے بچھڑے کی پوجا پاٹ سے توبہ کرنے کی وجہ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ نام تجویز پایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ [الأعراف ۱۵٦] ''ہم نے توبہ کیا۔'' گویا یہ نام اصل میں توبہ کرنے یا ایک دوسرے سے محبت رکھنے کی وجہ سے پڑا۔

﴿وَالنَّصٰرٰی﴾ سے مراد دین عیسوی کو اختیار کرنے والے ہیں۔ اسی لیے اردو دان لوگ انہیں ''عیسائی'' کہتے ہیں، اگرچہ قرآن وسنت میں انہیں کہیں بھی ''عیسائی'' نہیں کہا گیا ہے۔ نصاریٰ جمع ہے، اس کا مفرد نصران ہے، جیسے سکران جو فعلان کے وزن پر ہو، اس کی جمع قیاسی فَعَالٰی کے وزن پر آتی ہے، جیسے سکاریٰ یا اس کا مفرد عرب کے مشہور استعمال کے مطابق نصرانيّ ہے۔ ''نصاریٰ'' کی وجہ تسمیہ میں مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

(۱) یہ لوگ ناصرۃ نامی بستی میں رہائش پذیر تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بستی تھی یا آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس بستی میں اتریں گے۔

(۲) اس کا مادہ نصرۃ ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کی وجہ سے یہ نام پڑا۔ اسی لیے انہیں أنصار بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حواریین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا تھا: ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ [آل عمران ۵۲]

﴿وَالصّٰبِئِيْنَ﴾ یہ صَابٍ یا صابئٌ کی جمع ہے۔ اسی لیے اس کے اصل مادّے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ صَبا یصْبُو سے مشتق ہے، جس کے معنی مائل ہونے کے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک صَبَا سے مشتق ہے، جس کے معنی خروج کے ہیں۔ کہا جاتا ہے صَبَأتِ النجوم: ستارے طلوع ہوئے۔ صبأتْ ثنيةُ الغلامِ: بچے کے دانت نکل گئے۔ اسی مفہوم میں باپ دادا کے تقلیدی دین (بت پرستی) سے نکل کر اسلام قبول کرنے والوں کو عرب صابِئٌ، صَابٍ کہنے لگے۔ یعنی ''ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والا۔''

آیت مبارکہ میں مذکور صابئین کے بارے میں تفسیر ابن ابی حاتم میں آٹھ اقوال منقول ہیں:

(۱) یہود اور نصاریٰ کے درمیان ایک قوم ہے۔ (۲) یہود، نصاریٰ اور مجوس کے درمیان ایک قوم ہے۔ (۳) اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ (۴) مجوسیوں کی طرح ایک قوم ہے۔ (۵) عراق کے قریب بکوش نامی جگہ میں ایک قوم ہے، وہ تمام انبیاء کو مانتے تھے، ایک ماہ کا روزہ رکھتے تھے، یمن کی طرف منہ کرکے پانچ وقت نماز پڑھتے تھے۔ (٦) زبور پڑھنے والا ایک مذہب تھا، وہ قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتے؛ لیکن فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ (۷) وہ کسی بھی دین کے پیروکار نہیں تھے؛ لیکن اللہ کی توحید اور فطرت پر قائم تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ اور شیخ ابن العثیمینؒ نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ (۸) مجوس اور یہود کے درمیان ایک قوم تھی، ان کا الگ دین نہیں تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن علماء نے انہیں اہل کتاب کا فرقہ قرار دیا ہے، ان میں سے بہت سے لوگوں نے ان کا ذبیحہ حلال اور ان کی پاکدامن خواتین سے نکاح کو جائز بھی قرار دیا ہے۔

﴿مَن اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ یہ جملہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ پر عطف کی وجہ سے محلاً منصوب ہے۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ حضرت ابن عباس ؓ سے ثابت ہے کہ "جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کرے اور شریعت پر ایمان لائے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت کے آغاز میں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد شریعت اسلامیہ پر ایمان رکھنے والے ہیں تو دوبارہ ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ حافظ ابن جریرؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ والیومِ الاٰخِرِ﴾ سے مراد وہ مؤمن ہیں جو ایمان پر تاحیات ثابت قدم رہے۔ اسی طرح یہود ونصاریٰ میں سے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لا کر حق پر قائم رہے، اور موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتے ہوئے عمل صالح کرتے رہے، ان کے لیے نجات ہوگی۔

﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ محلاً مجزوم ہے، کیونکہ یہ ﴿مَن اٰمن بِاللّٰهِ﴾ جملہ شرطیہ کا جواب ہے۔ اسی لیے اس پر فا داخل ہوا ہے۔ ﴿لهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ میں ضمیر جمع ہے، تو ﴿مَنْ اٰمَنَ﴾ میں فعل مفرد کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿مَنْ﴾ لفظاً مفرد ہے، لیکن معناً جمع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس لفظی اعتبار سے فعل مفرد استعمال ہوا اور معنوی اعتبار سے ﴿فلهُمْ اَجْرُهم﴾ میں ضمائر جمع لائی گئیں۔

﴿لهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ حضرت قتادہؒ سے بسند حسن مروی ہے کہ ان کی نیکیوں کا بڑا اجر انہیں جنت کی صورت میں ملے گا۔ اجر اجرت سے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت عظیم مہربانی ہے کہ جس طرح کسی مزدور کو اجرت دینا لازمی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت سے اہل ایمان کو اجر وثواب دینا اپنے اوپر لازم فرما رکھا ہے۔

﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی نسبت اہل ایمان کی طرف کر کے ان کے شرف ومقام کو ظاہر فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے لیے اجر وثواب کی ضمانت بھی عطا کر رہے ہیں، کہ ان کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا۔ اور یہ نسبت تشریفی اور تکریمی ہے۔

﴿وَلا خوفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ "خوف" آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف ومصیبت کے اندیشے کو کہا جاتا ہے اور حزنٌ ماضی میں کسی مقصد میں ناکامی سے پیدا ہونے والے غم اور مصیبت کو کہا جاتا ہے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے اور حزن کا تعلق ماضی سے ہے۔ مصیبت میں مبتلا شخص کو محزون اور خطرہ کے اندیشے سے پریشان شخص کو خائف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا جاتا ہے۔ لیکن کبھی خوف اور حزن ایک دوسرے کے معانی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾[التوبة ٤٠] یہاں لا تحزن "لا تخف" کے معنی میں ہے۔ ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ یعنی انہیں مستقبل میں عذابِ قبر، قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذابِ الیم وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ یعنی دنیا میں جو کچھ وہ چھوڑ آئے ہیں اس پر انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی؛ کیونکہ اہل ایمان دنیا سے جاتے وقت ایک عظیم ترین لامتناہی خیر و بھلائی کی طرف جا رہے ہوتے ہیں؛ جبکہ کافر کو دنیا میں برتی ہوئی کوتاہیوں اور کرتوتوں پر حسرت و ندامت ہوگی۔ اسی لیے وہ پریشانی میں غرق ہوگا۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ﴾ [الزمر ٥٩-٦٠، الطبريؒ، ابن عطيةؒ، القرطبيؒ، ابن كثيرؒ، الشوكانيؒ، ابن أبي حاتمؒ، ابن الجوزيؒ، البغويؒ، السعديؒ، ابن العثيمينؒ]

آیت مبارکہ سے مستنبط فوائد:

فائدہ نمبر 1: سابقہ آیات میں جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہودیوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کی مذمت فرمائی، تو ذہن میں یہ اشکال پیدا ہونے لگا کہ سارے بنی اسرائیل ایسے ہی ہوں گے۔ تو زیرِ تفسیر آیت مبارکہ میں اس اشکال کو دور کیا گیا کہ یہودیوں، نصرانیوں اور صابئین میں سے اپنے اپنے انبیاء کرام کے دور میں اور ان کے بعد بھی ایسے گروہ موجود رہے ہیں جو ایمانِ صحیح اور اعمال صالحہ پر گامزن تھے، لہٰذا ان کا کوئی اجر ضائع نہیں ہوگا۔

یہ قرآن مجید کا محیر العقول اسلوبِ بیان ہے کہ جہاں کہیں اس کے فہم میں کوئی اشکال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو وہاں اس متوقع اشکال کا حل بھی ساتھ ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو یہ رب العالمین کا کلام ہے، جو ہر چیز کے وجود سے پہلے اس کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ اسی اسلوبِ قرآنی سے یہ فائدہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی گروہ کے عیوب کا تذکرہ ہو تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ان میں کوئی اہل خیر بھی ہوں، تو ان کا ذکر خیر بھی ضرور کیا جائے؛ تاکہ سابقہ مذمت کی زد میں سب نہ آئیں۔ [السعديؒ، ابن العثيمينؒ]

فائدہ نمبر ۲: یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾[المائدة ١٨] "ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔" یہود یہ دعویٰ اس لیے کرتے تھے کہ وہ پیغمبروں کی اولاد تھے۔ اور نصاریٰ اس لیے کہ وہ اپنے زعم باطل کے مطابق اللہ کے بیٹے مسیح ابن مریم علیہ السلام کی امت ہیں۔ جو ان کے خودساختہ عقائد کے مطابق امت کے گناہوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کفارے میں سولی پر چڑھ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اس مزعومہ عقیدہ پر ضرب کاری لگاتے ہوئے فرمایا کہ کوئی بھی شخص خواہ یہودی ہو یا نصرانی جو بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان کامل رکھے اور جواب دہی کے ڈر سے عمل صالح انجام دے گا صرف اسی کو نجات ملے گی۔ نسبی رشتے اور تعلقات اس دن کسی کام نہ آئیں گے۔[كيلانيؒ]

یہاں سے معلوم ہوا کہ عبرت کا تعلق الفاظ سے نہیں، بلکہ حقائق سے ہے۔ اس لیے اگر کوئی منافق جس نے اسلام کو دل سے قبول نہ کیا ہو یہ دعویٰ کرے کہ "میں پکا سچا مسلمان ہوں" تو اسے یہ دعویٰ الٹا فائدہ کے بجائے مزید نقصان دے گا۔ اسی طرح اگر کوئی یہودی اور نصرانی اگر نجات کا دعویٰ کرے تو کچھ بھی کارآمد نہیں ہوگا۔ کیونکہ نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کے دین کے سوا کوئی بھی دین معتبر و مقبول نہیں ہے۔[الكيلانيؒ ، الجزائريؒ]

فائدہ نمبر۳: ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ آیت مبارکہ میں نجات کے لیے ایمان اور عقائدی امور کو اساس قرار دیا گیا۔ عقائد کی اصلاح کے بعد عمل صالح کو ضروری قرار دیا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بھی عمل صالح کو ایمان کے بعد ذکر فرمایا۔

کسی بھی عمل کے "صالح" ہونے کے لیے بنیادی طور پر دو شرطیں ہیں: (۱) اخلاصِ نیت، (۲) اتباعِ سنت

فائدہ نمبر۴: ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کے ضمن میں باقی ارکانِ ایمان بھی داخل ہیں؛ کیونکہ تمام رسولوں نے اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ اسی طرح ایمان باللہ والیوم الآخر تمام آسمانی کتابوں میں ایک اساسی موضوع ہے۔ پس ایمان باللہ والیوم الآخر کی معرفت کا انحصار ایمان بالرسل والکتب پر ہے۔[القرطبيؒ ، ابن عطيةؒ]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتب میں اور اس کے رسولوں نے اپنی احادیث میں فرشتوں اور تقدیر پر ایمان کو بھی ایمان کی اساس قرار دی ہے۔ لہٰذا حدیث جبریل علیہ السلام میں مذکور ارکانِ ایمان آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

فائدہ نمبر۵: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ جو بھی اللہ پر اور روزِ آخرت پر صحیح ایمان لاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اور اللہ پاک کی عدالت میں مساوات ہے، یہاں تقویٰ کے بغیر کسی جنس کو کسی جنس پر فضیلت اور فوقیت نہیں ہے۔ یہودی، نصرانی اور صابی اپنے انبیاء کے ادوار میں اگر انہوں نے ایمان صحیح اختیار کیا ہو تو وہ اسی طرح دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہوں گے، جس طرح امت محمدیہ کے اہل ایمان کامرانی سے سرشار ہوں گے۔

اگرچہ امت محمدیہ دیگر تمام امتوں سے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔[ابن العثيمينؒ]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فائدہ نمبر۶: آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کے ثمرات اور فوائد کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اجر کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا اور ان پر خوف اور غم لاحق نہ ہونے کی گارنٹی دی۔ پس انہیں ہر قسم کی خوشیاں، سرور، لذتیں اور رحمتیں میسر آئیں گی۔[ابن العثیمینؒ، الجزائریؒ]

فائدہ نمبر۷: ﴿لَهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ﴾ میں اللہ نے مؤمنوں کے اجر کی نسبت اپنی طرف کر کے اپنے ہاں ان بندوں کے مقامات و درجات کی بلندی کو اجاگر فرمایا ہے۔ اور ان کے اجر کی عظمت کو بھی واضح کر دیا ہے۔[ابن العثیمین]

فائدہ نمبر۸: بعض لوگوں نے زیر تفسیر آیت مبارکہ سے یہ بات ثابت کرنے کی ناروا کوشش کی ہے کہ بعثت محمدی کے بعد بھی اگر یہودی، نصرانی اور صابی اپنے اپنے دین پر قائم رہ کر نیک اعمال کرتے رہیں تو مسلمانوں کی طرح ان کی نجات بھی ممکن ہے۔ اس طرح انہوں نے **"وحدتِ ادیان"** کا فلسفہ پیش کیا۔

لیکن یہ دعویٰ سراسر باطل اور بالکل غلط ہے۔ آیت مبارکہ یا کسی اور نص شرعی سے یہ دعویٰ کسی طور بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس بطلان کی وضاحت درج ذیل وجوہات سے ہوتی ہے:

{1}: زیر تفسیر آیت کے سیاق وسباق سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ بنی اسرائیل کے برے کردار کی مذمت آئی تو زیر تفسیر آیت سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا جو یہودیت اور نصرانیت کے منسوخ ہونے سے پہلے اپنے اپنے انبیاء کرام کی تعلیمات پر کاربند تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت مبارکہ کا بعثت محمدی کے بعد والے اہل کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

{2}: آیت کا سبب نزول حضرت سلمان فارسی ﷺ کا دورِ جاہلیت کے ساتھیوں کے متعلق سوال تھا جو اپنے علم کی حد تک صحیح عیسائی دین پر قائم تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آیت کا تعلق صرف منسوخی سے قبل کے اہل کتاب سے ہی ہے۔

{3}: آیت مبارکہ نے نجات یافتہ یہود، نصاریٰ اور صابئین کے لیے ﴿ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَعَمِلَ صَٰلِحٗا﴾ کی شرط لگائی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر "ایمان" کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے مبعوث کردہ تمام انبیاء کرام اور ان پر نازل شدہ تمام کتب پر ایمان لائے۔ ان میں سے کسی ایک نبی پر ایمان نہ لانے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔ تو نبی آخر الزمان ﷺ کا زمانہ پانے کے بعد آپ ﷺ کی تکذیب کرنے والے کو نجات کیسے مل سکے گی؟!

{4}: نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے بعد کسی بھی اہل کتاب کا ایمان معتبر نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ اپنی یہودیت ونصرانیت پر قائم بھی نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی سابقہ کتابوں میں آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ بلکہ تورات وانجیل میں اہل کتاب سے عہد بھی لیا ہے کہ آخری نبی ﷺ کا زمانہ پانے کی صورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ان پر ضرور ایمان لائیں گے جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ اور سورۃ الصّف آیت ۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔ اور اس عہد کا تذکرہ تورات وانجیل میں بھی صراحت کے ساتھ موجود تھا۔ دیکھیے: انجیل یوحنا، باب: ۱۴، فقرہ: ۱۶، ۱۷، ۲۶، ۳۰۔ باب: ۱۵، فقرہ: ۲۶۔ باب: ۱۶، فقرہ: ۱۲، ۱۳۔ اور انجیل برنا باس میں نبی آخر الزمان محمد ﷺ کے نام کی صراحت (سریانی میں ترجمہ: فارقلیط) آیا ہے۔ استثناء باب: ۱۸، فقرہ: ۱۵-۱۹، باب: ۳۳، فقرہ: ۲۔ متیٰ باب: ۳، فقرہ: ۱-۱۲۔ یوحنا باب: ۱، فقرہ: ۱۹-۲۲، باب: ۱۴، فقرہ ۱۵-۱۷، ۲۵-۲۷ وغیرہ۔ مزید دیکھیے: تفسیر القرآن الکریم حافظ عبدالسلام بھٹوی ۱/ ۶۸۹ آیت: ۱۵۷]

{5}: ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ زیر تفسیر آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ﴿وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ﴾ [آل عمران ۸۵] نازل فرمائی۔ یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق زیر تفسیر آیت اس آیت سے منسوخ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے جمہور مفسرین کی رائے سے مختلف نہیں، بلکہ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ آیت مبارکہ میں یہودی اور عیسائی سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے والے اہل ایمان ہیں۔ لیکن حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اکثر اسلاف رحمہم اللہ "نسخ" سے مراد عموم معنی لیتے ہیں۔ اور نسخ کے معانی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی آیت کے بارے میں کسی مدلول کا گمان کیا جا سکتا ہو اور نسخ سے مزعومہ مفہوم کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ یعنی زیر تفسیر آیت سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد بھی یہود و نصاریٰ کے لیے نجات کی گنجائش ہوگی، تو اس مزعومہ مفہوم کو سرے سے رد کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی گئی۔ آپ رحمہ اللہ کہتے ہیں: مذکورہ مفہوم کس طرح معتبر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا کہ "اسلام" کے بغیر اللہ کے ہاں کوئی اور دین قابل قبول نہیں ہے۔ ﴿وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ وَهُوَ فِي الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾ [آل عمران ۸۵]

{6}: اگر ہم بحث کی خاطر تسلیم کرلیں کہ آیت مبارکہ میں وحدتِ ادیان کی دلیل ہے، تو اس میں تعارض لازم آتا ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ خود یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی درست نہیں۔ یہودیوں کے ہاں بالاجماع نصرانی کافر ہیں۔ اور عیسائیوں کے عقیدے میں بجا طور پر یہودی کافر ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا متفقہ نظریہ وعقیدہ ہے کہ بعثت محمدیہ کے بعد ایمان نہ لانے والے سارے اہل کتاب کافر ہیں۔ جبکہ آیت کا مزعومہ مفہوم تمام ادیان کو درست قرار دیتا ہے۔

{7}: وحدتِ ادیان کے بطلان کے لیے کتاب الٰہی وسنت نبوی میں قطعی اور صریح نصوص موجود ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قیامت تک کے لیے تمام انسانیت کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا﴾ [الأعراف ۱۵۸]، ﴿وَمَاۤ

© rasailojaraid.com